ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.3 (2024)
(July to September)

شمس الرحمان کے ناول "کئی چاند تھے سر آسماں" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

A Research and Critical Review of Shamsur Rahman's Novel "Kai Chand Thaye Sar-e-Asmaan"

ڈاکٹر احمد حسین ہادی
ہوسٹن، یو۔ ایس۔ اے
ڈاکٹر فرید حسینی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف چکوال، چکوال

Dr. Ahmad Hussain Haady
Houston, U.S.A.
drahhnd@gmail.com
Dr. Fareed Hussaini
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Chakwal, Chakwal.
ghulam.fareed@uoc.edu.pk

Abstract:
Shams-ur-Rehman Farooqui is a well known literary figure who initially established his name in urdu criticism. As editor of literay journal "Shab Khoon" he not only challenged the traditional critical theories but also reserved himself and his journal pages for new and modern thoughts in prose and verse.Farooqui, by his critical thought, introduced new angles of literature i.e., eastern poetics exploring of ancient classic literature and uniqueness of Meer Taqi Meer. He was a keen researcher and always tried to bring new aspects. As an artist (Creative Writer), he wrote many short stories but his novel "Kai Chand Thay Sar-e-Asman (Mirror of Beauty) gave him fame. He potrays old Indian culture prevailed in 18th & 19th centuries B.C. The story has many historic persons (including the central character Wazir Begum) which made this historic too. The plot contains the materials in shape of events which become the causes of down fall of Mughal Kingdom & great civilization. As fiction writer, Shams used multiple artistic tools & techniques to intact the reader's intention and interest. In this article efforts have been made analyse the story & develop some point of views.

Keywords: Shams-ur-Rehman Farooqui, Civilization, Poetics, William, Marstan Blake, Hindustan, Mirza Ghalib

شمس الرحمن فاروقی کی بنیادی پہچان تنقید نگار کے طور پر مسلم ہے, انھوں نے مغربی و مشرقی علمی و ادبی سرمائے سے بھرپور استفادہ کیا اور اردو نقد کو نئے زاویوں سے روشناس کرایا۔ جس کا آغاز مولانا محمد حسین آزاد نے کیا تھا یعنی ان کی کتاب "آبِ حیات" سے لے کر شمس الرحمن فاروقی کے اپنے زمانے تک جتنا سفر طے کیا وہ یقیناً قابل صد تحسین ہے مگر فاروقی صاحب نے ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا کہ مغربی ادبی تھیوریز کو مشرقی فن پاروں پر منطبق کر کے ان کی تفہیم کرنا درست نہیں۔ پھر اپنے دعوے کی دلیل میں دلائل کے انبار لگا دیے۔ دوسرا اہم پہلو جو ہمیشہ وہ مد نظر رکھے رہے' مشرقی شعریات کی بازیافت تھا، لگے بندھے (Sterio Type) نظریات اور

آراء جو کلیشے کا درجہ اختیار کر چکے تھے' ان کو انھوں نے چیلنج کیا اور نئی تعبیریں پیش کیں۔ اس دوران وہ افسانے بھی لکھتے رہے مگر ان کی تنقیدی و تحقیقی حیثیت غالب رہی اور بطور تخلیق کار ان کا نام اسٹیبلش نہ ہو سکا۔ پھر اچانک سے ایک ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" منظر عام پر آیا اور ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ یہ ناول تاریخ و تہذیب کا مرقع ہے۔ ناول نگار نے خود اس فن پارے کو تاریخی قرار نہیں دیا مگر دوران قرات ایک خاص عہد آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"اس ناول کو انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب انسانی سرکاروں کا مرکز سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہو گا۔" (۱)

ناول میں تذکروں اور روایتوں کے توسل سے انسانی شجروں کو کھوجنے کی سعی کی گئی ہے جو حقیقت میں اپنی جڑوں سے جڑے رہنے کی شدید خواہش کا اظہار ہے۔ راوی کا پیشہ طب ہے مگر وہ اپنے ذوق کی تسکین ان الفاظ میں کرتا ہے:

"اگر میں زمانۂ قدیم میں ہوتا تو مجھے نساب کہا جاتا اس معنی میں مجھے خاندانوں کے حالات معلوم کرنے، ان کے شجرے بنانے اور دور دور کے گھرانوں کی کڑیوں سے کڑیاں ملانے کا شوق ہے۔" (۲)

کہانی میں ۱۸ویں صدی کے ہندوستان کا نقشہ بیان ہوا ہے، جب ایک گاؤں میں لوگ تصویریں بناتے تھے۔ شروع میں ناول نگار نے آرٹ کے ذکر سے تہذیب کی کارفرمائی بتائی ہے۔ پھر اچانک مرہٹوں کی شورش نے مغل اقتدار کو کمزور کر دیا۔ ظالم راجہ مہاراول گجرپتی مرزا کا خیالی تصویر کو بیٹی سے مشابہ قرار دے کر پھاڑ ڈالنا اور اپنی بیٹی کو قتل کرنا اور گاؤں کی بربادی، درحقیقت اس اندرونی خلفشار کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے سیاسی حالات دگرگوں ہوئے اور بیرونی حملہ آوروں (invaders) کو دراندازی کا موقع میسر آ گیا، جس کے نتیجے میں مرکزی حکومت ضعف کا شکار ہوئی اور سماجی، معاشی اور معاشرتی بحرانوں نے جنم لیا۔ اس سے قبل یہ صدیوں سے ایک پرامن اور ترقی یافتہ خطہ تھا۔ جس کا کئی مغربی سیاحوں اور مورخین نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ فرانسیسی دانشور گستاولی بان نے اس زمانے کی ہندوستان کی تصویر کشی یوں کی ہے:

"گجرات (انڈیا) میں مارکوپولو کو بکثرت شہر ملے جن میں تجارت ترقی پر تھی ان کی خاص صفت تانبے کے برتن تھے۔" (۳)

یہ تیرھویں صدی کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے فکشن کے پیرائے میں اس تمدن کو بیان کیا ہے جو دنیا میں مثالی تھا مخصوص اللہ کی بنائی ہوئی شبیہ میں ملکی تہذیب کی صورت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یوں بھی عورت کو ماں کا رتبہ حاصل ہے، جو نسل انسانی کی بقا کی ضامن ہے۔ پھر عورت اور دھرتی کو ایک معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں تصویر کی تمام رعنائی اور حسن دھرتی ماں کے نقوش اجاگر کرتی ہیں:

"کھلتا ہوا گندمی رنگ منہ پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ کی شفق اور فنکار اس قدر مشاق تھا کے مسکراہٹ کی وجہ سے کلوں کی لوؤں کی سرخی اور خفیف کھینچاؤ دکھائی دیتا تھا بلکہ محسوس ہوتا تھا۔" (۴)

اس حسین خطے کے نقش و نگار کو بگاڑنے میں مقامی ہوس کاروں کا ہاتھ تھا۔ اورنگزیب عالمگیر کی موت کے بعد محلاتی سازشوں اور مغلوں کی خاندانی رقابتوں نے صوبیداروں اور تعلقہ داروں کو من مانیاں کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں مصنف "تاریخ

اودھ" راقم طراز ہیں:

> "اورنگزیب عالمگیر کے عہد کے اخری ایام میں دولت مغلیہ کی وہی حالت ہو گئی تھی جو لوئی چہار دہم کی آخری دنوں میں سلطنت فرانس کی تھی۔ طویل جنگ و مذہبی تعصب بادشاہ کی سرد مہری اور مشکوک مزاجی اور فتوحات کے مرض نے اور ان سے زیادہ مغلوں کے باہمی عناد اور دادو عیش پسندی اور ارام طلبی نے سلطنت کی بنیاد ہلادی تھی۔"(۵)

چور اُچکے اور اٹھائی گیرے لوٹ مار میں لگ گئے۔ اس کا نتیجہ افغانی اور ایرانیوں کی ہندوستان امد کی صورت میں بر آمد ہوا۔ اس تمام عرصے میں انگریز بطور تاجر یہاں اپنے کاروبار کے ساتھ ساتھ حالات کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ ۱۸ویں صدی کے آخری چند سالوں میں جو نقشہ تھا وہ ناول کے واقعات سے واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کی شکست کے بعد انگریزوں کے لیے پورے ملک میں پھیلنا اور اپنے مقاصد کے لیے راستہ ہموار کرنا آسان ہو گیا۔ کہانی کا مرکزی کردار وزیر بیگم پوری کہانی کا مدار المہام ہے جس کی پیدائش ۱۸۱۱ء میں ہوئی۔ چارلس مٹکاف ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جب دلی کا ریزیڈنٹ مقرر ہوا تو بہادر شاہ ظفر کی عملداری لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی اور وہ صرف نمائشی بادشاہ کی تصویر بن کے رہ گئے۔ اس لیے شاید ناول نگار نے قلعے اور بہادر شاہ کے ذکر کو لانا بھی مناسب نہیں جانا۔ دلی میں سیاسی مرکز ریزیڈنٹ افسر کی کوٹھی ٹھہری حتی کہ سماجی اور معاشرتی اور ادبی سرگرمیاں بھی انگریزوں کی شمولیت کے بغیر ادھوری ہوتی تھیں۔ مغل شہنشاہ کی مرکزی حکومت کے خیر خواہ اور تابع فرمان چند نوابین تھے جن کی ریاستیں مالی معاملات کے ذریعے قلعے کے بجٹ کی ذمہ دار تھیں۔ انگریز افسران نے ایک منصوبے کے تحت ان کو ایک ایک کر کے نشانے پہ رکھا چنانچہ اس ضمن میں والئ فیروز پر جھرکا نواب شمس الدین احمد کے ساتھ ولیم فریزر کی رقابت خوبصورت فکشنل پیرائے میں بیان ہوئی ہے۔ ایک طرف نواب کی سادگی، شجاعت، غیرت و حمیت اور مشرقیت تھی جبکہ دوسری طرف عیاری اور چالاکی تھی اور نتیجتاً موخر الذکر کو کامیابی ملی۔ اس مسابقت یا لڑائی میں نو آبادیاتی طاقت کا پلڑا کیوں بھاری رہا، اس کا جواب بھی پلاٹ کے اندر موجود ہے۔

ولیم فریزر کے قتل کے بعد فتح اللہ بیگ، جو نواب شمس الدین کا رشتہ دار تھا، کی نواب کے خلاف گواہی اس امر کی طرف اشارہ ہے، جس میں مقامی غدار اپنوں کے خلاف جھوٹی شہادتیں دے کر انگریزوں کی حمایت کر رہے تھے۔ یہ لوگ ننگ دین، ننگ وطن اور ننگ قوم تھے۔ اور یہ جانتے تھے کہ اس طرح کے کردار سے ملک و قوم غلامی اور تباہی کی جانب چلے جائیں گے۔ الہی بخش جو مغلوں کا رشتہ دار تھا کے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں اور دوسرے شہزادوں کو گرفتار کروانا اس سلسلے کی کڑیاں تھی اور یہ فہرست میر صادق اور میر جعفر تک دراز تھی، جس کی تاریخی حیثیت کی طرف ناول میں اشارے کیے گئے ہیں اور تشبیہاتی انداز میں ان واقعات کو کہانی میں جوڑا ہے۔ ایک بات بڑے التزام سے ناول میں ملتی ہے کہ انگریز جتنے بھی ذاتی طور پر جینٹل مین (Gentle Man) ہوتے مگر ہندوستانیوں کے بارے میں ان کا رویہ متعصبانہ اور حاکمانہ تھا۔ یہاں پر تعینات ہونے والے یورپی خصوصا انگریز انگلستان میں معمولی حیثیت کے مالک ہوتے مثلا ایک صاحب کے بارے میں تاریخ میں درج ہے کہ وہ ہندوستانی فوج میں کپتان تھا مگر اس سے قبل جرمنی میں ٹیکسی چلاتا تھا۔ کالونی کے طور پر یہاں پوسٹنگ لینے سے پہلے ان کی تربیت کی جاتی تھی اور انہیں نسلی تعصب (جو کہ وہ ہر گورے کو کالوں کے بارے میں عموماً تھا اور آج بھی ہے) اور آقائی کے طور طریقے ازبر کرائے جاتے تھے. اور غلاموں کے ساتھ سلوک اور رویے کے ضمن میں حد سے زیادہ احتیاط برتنے کی ہدایات دی جاتی تھیں۔ ناول کی ہیروئن نے جس انگریز افسر کے ساتھ رہنے فیصلہ کیا اس میں کئی خوبیاں تھیں مگر اس کی رائے مقامیوں کے

متعلق کیا تھی ملاحظہ ہو:

"وزیر بیگم تو یہ دیکھتی تھی کہ مارسٹن کے گھر چوریاں بہت ہوتی تھیں۔ مارسٹن بلیک ان چوریوں سے کسی بڑے مالی نقصان میں تو نہ آتا لیکن الجھتا اور جھنجلاتا بہت تھا۔ کبھی کبھی چڑچڑا کر وزیر سے یہ بھی کہہ گزرتا کہ تم ہندوستانی بہت چور اور بے ایمان ہو۔"(۶)

ولیم فریزر کے کردار میں پوری نو آبادیاتی طاقت مجسم کر دی گئی ہے۔ وہ عیاری، مکاری، چالاکی اور منافقت کا عمدہ نمونہ تھا۔ طول و عرض میں شہروں کی حد تک لوگ خوشحال تھے اور انگریزی برکات سے مستفید ہو رہے تھے۔ مقامی صنعتوں، سرکاری ملازمت اور ٹیکنالوجی وغیرہ کے استعمال سے وہ مسرور تھے مگر اکثریت جو دیہاتوں پر مشتمل تھی وہ انگریزی راج سے نالاں تھی۔ بہت سارے طبقوں میں منقسم معاشروں کو انگریزوں نے شہری و دیہی (نئی) تفریق میں بھی ڈال دیا تھا۔ اس حقیقت کو ایک انگریز عورت کی زبانی یوں بیان کیا گیا ہے:

"بات یہ ہے کہ کمپنی راج میں شہر والے تو آرام سے ہیں لیکن گاؤں کے لوگوں کو بہت پریشانیاں ہیں۔ کمپنی نے لگان بڑھا دیے ہیں، کسان اور زمیندار آپس میں خوش نہیں ہیں۔ مقامی صناعوں کو کام نہیں مل رہا ہے۔"(۷)

شمس الرحمن فاروقی نے اپنے تبحر علمی اور عمیق مطالعے کی بنا پر جو فن پارے پر رکھے اور ان میں جس طرح کے (خصوصاً فکشن کے باب میں) عیوب کو نشان زد کیا، اپنے ناول میں ان کمزوریوں کو مد نظر رکھا اور سعی کی کہ تخلیق ان نقائص سے پاک رہے۔ افسانہ اور ناول میں وہ کہانی پن پر بہت زور دیتے تھے چنانچہ "کئی چاند تھے سر آسماں" کامیابی سے قاری کے ساتھ ربط پر قرار رکھتا ہے۔ وزیر بیگم کے کردار میں جو حسن و دلکشی اور خوبصورتی ہے، دراصل مشرقی تہذیب کا زیور ہے۔ فنون لطیفہ اور شعر و ادب کا ذکر بھی ثقافت کی عمدگی اور مثالیت پر دلیل ہے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود کئی جگہوں پر ناول میں محقق اور نقاد شمس الرحمان فاروقی کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان کے اپنے نظریات اور پسند و ناپسند کی جھلک بھی کہیں کہیں ظاہر ہو جاتی ہے مثلاً مرزا غالب کی حیثیت کو بطور نقاد انہوں نے میر سے کمتر ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی یا یوں کہ میر پر مرزا کی برتری کو ماننے میں ہچکچاتے رہے۔ ناول میں مرزا غالب کی فنکاری تو مسلّم دکھائی گئی ہے مگر ان کا معذرت خانہ رویہ (انگریزوں کی طرف) پر چوٹ کی گئی ہے اور انہیں ایک طرح سے خوشامد پسند تک دکھایا گیا ہے۔ کہانی میں ہر ہر منظر میں انھوں نے شاعرانہ نثر کے استعمال سے تحریر کو چار چاند لگائے ہیں۔ شعوری طور پر مقامی روایت کو خوب تر دکھایا گیا ہے۔ مخصوص اللہ شبیہ ساز کی بنائی گئی خیالی تصویر میں اس تہذیب کا عکس دکھائی پڑتا ہے:

"بڑی بڑی جامنی آنکھیں، پتلیوں کی سیاہی میں نہیں نیلگونی جھلکتی ہوئی، سیدھی ناک بظاہر ذرا لمبی لیکن دوبارہ دیکھیں تو بالکل مناسب معلوم ہو، ناک میں بڑا سا بلاق جس میں ایک سرمئی موتی، گردن اونچی، ناک نخوت اور اعتماد کی بلندی اس میں نمایاں تھی۔ گردن میں گول ترشے ہوئے جامنیاں کے دانوں کا ہار جس میں جگہ جگہ کئی زردی مائل گلابی پتھر کے بڑے بڑے دانے کشمیری ناشپاتیوں کی شکل میں تراشے گئے تھے۔"(۸)

فاروقی کے ہاں جذبات نگاری اور داستانوی طرزِ نگارش کی بدولت تحریر نہ صرف دلفریب ہوئی ہے بلکہ اس میں گہرائی اور گیرائی بھی آگئی ہے۔ قاری دوران قرأت دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے نازک اور لطیف نکات سے بھی آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ واقعات کی ترتیب میں ۱۸۵۷ء کے رونما ہونے سے پہلے کی پانچ دہائیوں کو فوکس کیا گیا ہے، کس طرح تمام تر رعنائیوں کے باوجود ایک تہذیب روبہ زوال تھی ۔ محض اقتدار نہ تھا، مغل شاہی طنطنہ نہ تھا وہ فقط سیاسی شکست خوردی نہ تھی بلکہ ایک سنہری دور غروب ہونے کے قریب تھا کیونکہ اب زندگی کے ہر شعبے میں یکسر تبدیلی ہونے جارہی تھی۔ پلاٹ میں اسی لیے حقیقی تاریخی شخصیات اور واقعات کو برتا گیا ہے تاکہ ناول کی تخلیق کا مقصد پورا ہو رہے۔ آنے والی نسلوں کو اس ورثے کے بارے میں آگاہی دی جائے جو فقط تاریخی کتابوں کی زینت بن کے رہ جائے گا ۔ انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کامیابی سے جاری رہی اور جس کا اختتام ۱۹۴۷ء میں ہوا اور اس کے اثرات آج بھی prevail کرتے ہیں. مگر اس کے باوجود ناول میں بھائی چارہ اور مقامی امن و محبت و ہم آہنگی کا بیان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ناول نگار نے غیر مسلم مقامی کرداروں کا ذکر عقیدت سے کیا ہے، جس سے ان کی عظمت دوچند ہوتی ہے مثلاً پنڈت نند کشور کا ذکر ملاحظہ ہو:

> "پنڈت نند کشور سر تا پا سفید لباس میں تھے حتی کہ ان کا برہمنی طرز کا عمامہ بھی سفید تھا، ورنہ پروہت اور منجم عام طور پر گیروا عمامہ باندھتے تھے۔ دہلوی انداز کا پاجامہ، سفید لنگی کا مہریہ نہایت فراخ، کہ چلنے میں گھیتلی جوتی پائنچوں کے نیچے آجاتی تھی۔ ان کی داڑھی گھنی سفید تھی، گلے میں سفید گلوبند جس کے نیچے سے ردار قش بہت بڑے بڑے کتھئی دانوں کا مالا نظر آتا تھا۔ ان کے وجود کا سارا تاثر سفید اور نازک کپاس کے پھول جیسا تھا۔"(۹)

وزیر بیگم کا ولیم فریزر کو ٹھکرانا اور نواب شمس الدین احمد کو منتخب کرنا وہ عمل ہے جس سے ولیم فریزر رقابت کی آگ میں جلنے لگا اور وہ نواب شمس الدین کا جانی دشمن بن گیا۔ انگریزوں کی انہی ظالمانہ اقدامات نے عوام کو ان کے خلاف نفرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ شرفا اور روسا کی تذلیل اور تحقیر نے عام عوام کو ردعمل پر اکسایا۔ نواب فیروزپور جھرکا لوہارو کی بہن کا رشتہ مانگنے پر اس کا ولیم فریزر کی رہائش پر جاکر الجھنا اس غیرت و حمیت کی طرف اشارہ ہے جو مشرقیت میں بہر حال زندہ تھی۔ نو آبادیاتی سرکاری طاقت کی پشت پناہی سے مظالم روا رکھنا کھلم کھلا ہٹ دھرمی اور آقائی کے پندار میں مست ہونے کی دلیل تھی اور یہ اصول ملک کے طول عرض میں اپنا اثبات کر رہا تھا۔ نواب شمس الدین کی جائیداد کو چھین لینا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ غالب جیسے خالصتا ادیب کی پینشن کی بندش میں مسلم و مغل عناد اور دشمنی کارفرما تھی۔ حکومتی اختیارات کو انگریز انتظامی افسروں کا بیجا اور غیر ضروری استعمال کمپنی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہا تھا۔ معاشی ،سیاسی اور اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو کر مالی بدعنوانی میں فرد اور کمپنی دونوں گھٹنوں گھٹنوں دھنس گئے، جس کی طرف ناول میں جابجا اشارے کیے گئے ہیں:

"مارسٹن بلیک کی زبانی اس نے سنا تھا کہ جنرل اختر لونی صاحب کی موت (۱۸۲۵ء) کے بعد جو کول بروک (col brook) صاحب ریزیڈنٹ مقرر ہوئے تھے وہ بدعنوانیوں میں ماخوذ ہو کر معطل ہیں۔"(۱۰)

نوابوں اور رئیسوں کے ساتھ قلعۂ معلی میں بھی نو آبادی طاقت دھیرے دھیرے دخیل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ۱۸۰۲ء میں دلی میں فرنگی افواج داخل ہوئیں تو ابتدا میں وہ بادشاہ ظفر کو پورا پورا پروٹوکول دیتے رہے مگر بعد ازاں اختیارات اپنے قبضے میں لیتے گئے حتی کہ بادشاہ کو قلعے کے امور سر انجام دینے اور معاملات چلانے کے لیے بھی انگریزوں کا دست نگر ہونا پڑا۔ یہ صورتحال گلا گھونٹنے کے

مترادف تھی۔ ولیم کا قتل اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول میں یوں فکشن کی تمام مبادیات کو بروئے کار لایا گیا ہے، اس حصے میں سسپنس اور ہارر پیدا کر کے دلچسپی کو مہمیز دی گئی ہے۔ انگریز افسر کا انجام کہانی کے مقامی کرداروں کے ساتھ ساتھ قاری کے لئے بھی تمانیت کا سامان رکھتا ہے۔ ادب کی رو سے المیہ کے ساتھ طربیہ رنگ بھی موجود ہے مگر یہ سب حالات واقعات انگریزوں کے اقتدار کو مضبوط کرتے جاتے تھے۔ کریم خان جو ماہر نشانہ باز تھا اور بھرمار و مشہور تھا، سائے کی طرح انگریز ریزیڈنٹ کے ساتھ رہا۔ ۱۸۳۴ء کی کرسمس کے موقع پر ایک کوشش ناکام ہوئی۔ ۱۸۳۵ء مارچ کی ۲۲ تاریخ کشن گڑھ میں ایک جشن کا اہتمام کیا گیا۔ پارٹی ختم ہوئی تو شراب کی نشے میں دھت فریزر کو اٹھا کر بگھی میں ڈالا گیا۔ محافظوں کے دستے میں ایک مشکی گھوڑ سوار بھی شامل تھا جو محافظ نہ تھا۔ اسی رات ولیم فریزر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ کریم خان کے ساتھ دوسرا آدمی انیا میواتی بھی ہے۔ نواب شمس الدین کو جا کر اطلاع کرتا ہے۔ کریم خان اور نواب شمس الدین تو پھانسی چڑھ گئے مگر انیا میواتی فرار ہو کر بچ رہا۔ یہاں یہ نقطہ غور طلب ہے کہ پھانسیاں زیادہ تر مسلمانوں کی قسمت میں آئیں یا اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ مقامی افراد سے نرمی برتی گئی یا انہیں ساتھ ملایا گیا تا کہ اکثریت کو مطمئن رکھا جائے اور شراکت اقتدار کا جھانسہ دے کر اپنے تسلط کو طول دیا جا سکے۔ ۱۸۵۷ء کے جرم میں بعد ازاں گو کہ ہر نسل و قومیت کے لوگوں کو سزائیں ہوئیں مگر لانگ ٹرم نقصان مسلمانوں کا ہی ہوا۔ ناول کی کہانی میں اس واسطے مسلمان کرداروں کے ذریعے مدعا بیان ہوا ہے۔ فاروقی صاحب نے بطور خاص یہ التزام بھی ملحوظ رکھا کہ محقق اور نقاد کے ہاں جو کھردرا پن اور خشکی ہوتی ہے وہ ناول نگاری میں قریب سے بھی پھٹکنے نہ پائے۔ مناظر کا فطری حسن، حسن بیان کے ساتھ دوچند ہو گیا ہے:

> ”کل تک ہوا میں لطیف ٹھنڈک تھی اب اس میں ڈل (جھیل) پر تیرنے والے گھاس اور بنفشہ اور سوسن کے پھولوں سے لدے ہوئے بجروں سے ہمکتے ہوئے، رنگوں میں سبز، کاسنی، سوسنی، سرمئی کا بول بالا ہے۔ سب خوبانی کے پکے ہوئے پھلوں جیسی سنہری زرد خوشبو مدھ ماتیاں کرتی ہے۔“(۱۱)

ناول کی فنی جمالیات کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور واقعات اور کرداروں کو شوخ رنگوں کے ساتھ کہانی میں پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے ناول کی عمومی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:

> ”کرداروں تمثالوں اور وقوعہ کی شکل میں ہی صحیح ادب ماضی کی بازیافت ہوتا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں چونکہ انسانیت سیاسی نظریوں کی اویزش اور سیاسی نیرنگیوں کی زد میں رہی ہے اس لیے ان صدیوں کا ادب سیاسی فکر سے مملو ہے۔“(۱۲)

مغلوں کے آخری ادوار حکمرانی میں معاشرے میں امراء طبقے اور شاہی خاندان میں جو خرابیاں در آئی تھیں، وہی سیاسی ڈاؤن فال کا سبب بنیں مثلاً فوجی اور عسکری امور پر عدم توجہی سے بیرونی تجارتی کمپنیوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ معاشی طور پر طبقاتی تفاوت میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوا۔ اشرافیہ آسائشوں سے معمور زندگی بسر کر رہی تھی جو عیاشوں کی حدوں کو پہنچ چکی تھی۔ یہ طبقہ انگریزی تہذیب میں اپنا مفاد ڈھونڈ رہا تھا۔ مخلوط اکٹھ، شراب کی کھلی چھوٹ، دیسی اور ولایتی صنف نازک کی دستیابی ان کے لیے نعمت غیر معترقبہ ثابت ہو رہی تھی۔ ان سب کی قیمت مشرقی روایات کی قربانی سے چکائی جا رہی تھی اور مقامی اشرافیہ سے انگریزی حکام کا گٹھ جوڑ مرکزی حکومت کو خاتمے کی طرف لے جا رہا تھا۔ مرکزی کردار کا طوائف کی نواسی ہونا اور کوٹھے پر پرورش اور اس میں ڈومنی پن کا آجانا

اگر علامتی انداز میں لیا جائے اور اس کو ہندوستان کے شہری سماج اور سیاسی نظام پر منطبق کیا جائے تو ناول کی کہانی کے ابلاغ کا کینوس وسیع ہو جاتا ہے۔ زندگی کے اکثر شعبوں میں تنزلی کے باوجود شعر و ادب اپنے عروج پر تھا اور اردو زبان کلاسیک کے درجے پر پہنچ کر فارسی انگریزی سے ہمسری نہیں تو کم از کم اپنی ایک پہچان بنانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ کمپنی کے افسران اور کارپردازان تک اردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ممکن ہے یہ ان کی پیشہ ورانہ مجبوری یا نو آبادیاتی ہتھکنڈہ ہو مگر عام یورپی جو ہندوستان میں بس گئے تھے اور مقامی ثقافتی رنگ میں رنگ گئے تھے وہ بھی مقامی زبانوں میں تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر رہے تھے۔ اس نقطے کو اجاگر کرنے کے لیے شمس الرحمان فاروقی نے تاریخی واقعات اور شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جو خود ناول کی زبان اور اسلوب میں تو دلکشی ہے ہی، کلاسیکی فارسی اور اردو اشعار کا استعمال فن پارے کو وقیع بنانے میں مدد رہا ہے۔ ناول کا اسلوب دلکش اور دلفریب ہے جو اس کو ماسٹر پیس بنانے میں معاونت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد حسن رقم طراز ہیں:

> "اسلوب وہ قوت اظہار ہے جس میں صدیوں کی تہذیب بولتی ہے۔ ہر اسلوب محض صاحب اسلوب کی وراثت اور ذہانت ہی کی گواہی نہیں دیتا بلکہ زبان اور ادب کی چھپے ہوئے خزانوں کا سراغ بھی دیتا ہے۔"(۱۳)

شمالی ہندوستان کی ثقافت کو کتنے زاویوں سے انہوں نے کمال مہارت سے صفحہ قرطاس پر اتارا ہے، ملبوسات، ظروف، زیورات، ذرائع نقل و حمل اجناس غرضیکہ وطن کی ہر ہر چیز کو جزئیات میں بیان کیا ہے۔ سماج میں اونچ نیچ اور طبقاتی تفاوت کے باوجود انہوں نے مختلف پیشوں اور اہل حرفہ کو تہذیب کے organs کے طور پر پیش کیا ہے اور یہی اہل حرفہ ہی دراصل سماجی ہماہمی اور خوبصورتی کے عناصر تھے۔ شہنشاہ بابر نے اس ضمن میں لکھا ہے:

> "ہندوستان میں پیشوں کی تقسیم خوب ہے۔ ایک ہی پیشہ کے لوگ بکثرت ہوتے ہیں اور ضرورت پر ہزاروں آدمی ایک ہی کام کرنے والے دستیاب ہو جاتے ہیں۔"(۱۴)

شمس الرحمن فاروقی نے چونکہ اپنی پوری زندگی ادب کے لیے وقف کر دی تھی اور اس سلسلے میں طویل عرصے تک ان کا مجلہ "شب خون" نظم و نثر دونوں اصناف میں اردو کی خدمت پر مامور رہا۔ اہل زبان ہونے کی وجہ سے وہ اردو نثر کو بہترین بنانے میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ اس ناول کی تحریر اس بات کی شاہد ہے کہ وہ محمد حسین آزاد، ابو الکلام آزاد اور ان جیسے کلاسیک نثر لکھنے والوں کی پیروی میں خوبصورت فن پارے تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خود ان کا اپنا اس بارے میں قول ہے:

> " جس ادبی تہذیب میں نثر اچھی نہیں ہے اس کا ادب بے شک زوال پذیر ہے۔"(۱۵)

مخصوص اللہ کی مصوری، ان کی اولاد کی قالین بافی اور سادہ کاری تہذیب کے اس پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں جو کہ ترقی یافتہ ہونے کی دلیل تھی۔ وزیر خانم کا شعر و شاعری سے شغف بھی معراج تہذیب پر دال ہے۔ مغلیہ فرماں روائی کی روداد براہ راست ناول کے پلاٹ کا حصہ نہیں بنی مگر کچھ واقعات کے ٹکڑوں کو جوڑا جائے تو چند حقائق سے پردہ اٹھتا معلوم ہوتا ہے مثلاً انگریزوں کا مغلیہ مشیروں اور وزیروں کو بلاواسطہ اپنے دفتر اور رہائش گاہوں پر طلب کرنا ہر دو فریقین کی بالترتیب طاقت اور ضعف کا بھرم کھولتا ہے۔ مہاراجوں کا آقاؤں یعنی نو آبادیاتی سرغنوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کو دعوتوں پر بلانا مغلیہ اقتدار کی معدومیت کی طرف اشارہ ہے۔ وزیر

خانم کا مرزا فخرو ولی عہد سے شادی کرنا اور تھوڑی عرصے میں حیضے سے اس کا انتقال اور زینت محل (ملکہ ہند) کا بہو اور پوتے کو گھر سے نکال دینا اس امر کی غماضی کرتا ہے کہ لال قلعہ اندرونی سازشوں میں گھر چکا تھا اور یہ بات صرف قلعہ کی حد تک محدود نہیں تھی بلکہ ریاستوں کے راجوں کے ساتھ بھی یہی عمل دہرایا جارہا تھا۔ مثلاً ایک راجہ کے بارے میں یہ لکھا ہے:

"وہاں سارے فوجیوں میں چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں کہ مہاراجہ بہادر کے مختار عام لالہ جھونتارام چاہتے ہیں کہ مہاراجہ کو سامنے سے ہٹا کر اور ننھے مہاراجہ رام سنگھ کا اتالیق بن کر خود راج کرتے رہیں لیکن رعایا کو جھونتارام ایک آنکھ نہیں بھاتا۔" (۱۶)

شاہی عورتوں کا اپنے من پسند شہزادوں کے لیے لابنگ کرنا کہ وہ مستقبل کے شہنشاہ بن جائیں حقیقت سے آنکھیں چرانے کے مترادف تھا۔ اور یہ بھی کہ بہادر شاہ ظفر کی ملک میں عملداری تو کیا اپنے حرم میں لاچاری و مجبوری ظاہر کرتا ہے۔ وزیر بیگم جب قلعہ سے اپنے دو بیٹوں داغ دہلوی اور مرزا خورشید کے ساتھ باہر آئیں تو وہاں کھڑے محافظوں کو جو بخشیش دی وہ قابل غور ہے:

"اگلے دن مغرب کے بعد ایک چھوٹا سا قافلہ قلعۂ مبارک کے لاہوری دروازے سے باہر نکلا، ایک پالکی میں وزیر، ایک بہل پر اس کا ثالث البیت اور پالکی کی دائیں بائیں گھوڑوں پر نواب مرزا اور خورشید مرزا۔ محافظ خانوں والوں نے روکنے کے لیے ہاتھ پھیلائے تو مرزا خورشید عالم نے ایک ایک مٹھی اٹھنیاں چونیاں دونوں طرف لٹائیں اور یوں ہی سر اٹھائے نکل گئے۔ ان کے چہرے کسی قسم کے تاثر سے عاری تھے۔" (۱۷)

مشرقی روایت کو کس طرح جدت اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ کچل رہی تھی، پرانی طرز معاشرت اور سماجی ضابطے مغربی کلچر کے سامنے بے بسی سے پسپا ہوتے جارہے تھے:

"مقامی مہاراجوں کو انگریز نیٹو (natives) کہہ کر حقارت سے پکارتے تھے۔ اور رعایا کے اطوار سے نالاں تھے۔ مقامی افراد انگریز اور ان کے حمایت یافتہ حکمرانوں سے ہرگز خوش نہیں تھے۔ دیسی ریاستوں میں دربار کی مقامی سیاست، رانیوں کی آپس کی رقابتیں، فوج کے اخراجات، نالائق راجاؤں یا شہزادوں کی تربیت اور تدریب رعایا کی اندرونی بدامنی اور حالات ان سب پر نظر رکھنی پڑتی تھی۔ بہت سے صاحبان ریزیڈنٹ تو دن رات راج محلوں کے مخبروں ہی سے پوچھ گچھ اور خفیہ بات چیت میں لگے رہتے تھے۔" (۱۸)

تمام تر تحفظات اور اعتراضات کے باوجود یہ استعماری تہذیب لوکل تہذیب میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہو رہی تھی. کچھ حضرات یورپیوں سے مرعوب تھے اور ایک طبقہ ماڈرنزم کے شوق میں اپنی روایات کو بیکار محض قرار دے رہا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو نہ چاہتے ہوئے بھی اس تبدیلی کی زد میں آرہے تھے۔ اس کی ایک مثال خود وزیر خانم ہے۔ ناول میں ایک جگہ لکھا ہے:

"عام ہندوستانی شرفاء گھرانوں کی عورتوں کا کھانا مردوں کے کھا لینے کے بعد سب سے الگ پردے میں ہوتا تھا۔ باپ بھائی تک کو کھانے کے وقت زنان خانے میں

انے کی اجازت نہ تھی۔ چھوٹی بیگم کہتی، میں زہر کھا سکتی ہوں لیکن تمہارے ساتھ کھانا کھانے کی بے حیائی نہیں کر سکتی۔ بہت ضد ضدام کے بعد طے ہوا کہ رات کا کھانا صاحب مارسٹن بلیک اور بی بی اکٹھے کھائیں گے۔"(۱۹)

ناول نگار نے افراد کے رویوں اور کرداروں میں معنویت پیدا کی ہے کیونکہ انفرادی افعال سے ایک مجموعی تاثر ابھرتا ہے جو معاشرے کی تشکیل کرتا ہے اور کہانی میں بحیثیت مجموعی سماج کا عکس واقعات کی رونمائی میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک طرف نواب شمس الدین احمد جیسے کردار تھے جو حریت کے آئینہ دار تھے اور اسی قبیل کے لوگ اکثریت میں ہوتے تو برصغیر میں نو آبادی قائم ہونے ہی ناپاتی مگر زمینی حقائق یہ تھے کہ لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنی جگہ بنانے کے لیے استعمار کے دست و بازو بننے کو ترجیح دے رہے تھے ۔ شمس الرحمن فاروق نے رمز و کنایہ میں شاندار دور کے حسن و قبح بیان کیے ہیں۔ اس طرح کے ادبی فن پارے قوموں کے ادبی سرمائے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے اس دور کو انہوں نے اپنے زرخیز دماغ کی بدولت ماسٹر پیس کے طور پر محفوظ کیا ہے۔ ڈاکٹر عثمان فاروق نے ناول کے فن پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس (ماضی کے ورثے) کی بازیافت کا مقصد گزرے دنوں کو واپس لانا ہرگز نہیں یہ تو اپنی کائنات، پہچان، حقیقت کی تفہیم اور پوری تہذیب کے ادراک یا اس سے مربوط تجربوں اور برداشت کا منظر نامہ ہے۔"(۲۰)

ناول میں اشخاص پر بھی گرفت کی گئی ہے جو انگریزی افسر شاہی کو کورنش بجالاتے تھے اور انہیں بادشاہ کے برابر درجہ دینے پر قبل از وقت تیار تھے مثلاً مرزا اسد اللہ خان غالب کا ریزیڈنٹ کو پیر و مرشد کہنا:

"مرزا صاحب نے بطور خاص ولیم فریزر کو مخاطب کیا" ملاحظہ ہو پیر و مرشد "نواب شمس الدین خان کو یہ بات بری لگی کہ کسی انگریز نصرانی کو پیر و مرشد کہا جائے محمد روشن اختر بادشاہ غازی فردوس ارام گاہ کے زمانے تک صرف بادشاہ کو پیر مرشد کہتے تھے بعد میں الگ الگ ریاستوں کے نواب صوبہ دار اور راجہ کو بھی ان کے خاص مصاحبوں نے پیر و مرشد کہنا شروع کر دیا لیکن انگریز بے دین کو پیر و مرشد کہیں یہ نئی بات تھی۔"(۲۱)

انگریز اپنی عددی کمتری کے باوجود حکومت کرنے میں اس لیے کامیاب ہوئے کہ مقامی افراد کی اکثریت جو ان کے گرد جمع تھی احساس کمتری کا شکار تھی اور اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ ہندوستان پر مغل حکومت کرنے کے اہل نہیں رہے لہذا بیرونی قوت اس چیز کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رشید اشرف خان، ڈاکٹر، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ایک تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی، براؤن بک پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص: ۸۴

۲۔ ایضاً، ص: ۲۲۔۲۳

۳۔ گستاؤلی بان، ڈاکٹر، تمدن ہند، ترجمہ: سید علی بلگرامی، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۶۲ء، ص: ۳۵۲

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، کراچی، شہر زاد، ۲۰۰۶ء، ص:۱۱۰

۵۔ نجم الغنی، مولانا، تاریخ اودھ، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۸ء، ص:۷

۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، دہلی، پنگوئن بکس، ۲۰۱۵ء، ص:۱۸۶

۷۔ ایضاً، ص:۲۴۲

۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، ص:۱۱۰

۹۔ ایضاً، ص:۲۹۱۔۲۹۲

۱۰۔ ایضاً، ص:۲۳۱

۱۱۔ ایضاً، ص:۱۱۵

۱۲۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص:۴

۱۳۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۸ء، ص:۱۸

۱۴۔ قاضی جاوید، ہندی مسلم تہذیب، لاہور، وین گارڈ بکس لمیٹڈ، سن ندارد، ص:۱۱۸۔۱۱۹

۱۵۔ صفدر رشید، ڈاکٹر، شعر شعریات اور فکشن، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص:۴۸۳

۱۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، ص:۲۰۹

۱۷۔ ایضاً، ص:۸۴۵

۱۸۔ ایضاً، ص:۲۰۸

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۹۰

۲۰۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، ملتان، بیکن بکس، ص:۴۲۶۔۴۲۷

۲۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، ص:۲۴۹

References in Roman Script:

1. Rasheed Ashraf Khan, Dr., Kayee Chaand Thay Sar-e-Aasmaan:Aik Tanqidi Mutalaa, New Delhi, Brown Book Publications, 2017, p.84
2. Ibid, P.22-23
3. Gastaoli Baan, Dr.Tamaddan-e-Hind, Tarjuma: Syed Ali Bilgarami, Lahor, Maqbool Academy, 1962, p.352
4. Shams-ur-Rehman Farooqui, Kayee Chaand Thay Sar-e-Aasmaan, Karachi, Sheharzaad, 2006, p.110.
5. Najam-ul-Ghani, Molana, Tareekh-e-Awwadh, Karachi, Nafees Academy, 1978, p.7
6. Shams-ur-Rehman Farooqui, Kayee Chaand Thay Sar-e-Aasmaan, Delhi, Penguine Books, 2015, p.186
7. Ibid, p.242
8. Shams-ur-Rehman Farooqui, Kayee Chaand Thay Sar-e-Aasmaan,Same as above 4, p.110
9. Ibid, p.291.292

10. Ibid, p.231
11. Ibid, p.115
12. Khalid Ashra, Dr., Barr-e-Saghir Mein Urdu Novel, Lahore, Fiction House, 2005, p.4
13. Tariq Saeed, Asloob aur Asloobiyaat, Lahore, Nigarshaat, 1998, p.18
14. Qazi Javed, Hindi Muslim Tahzeeb, Lahore, Van Guard Books Limited, p.118.119
15. Safdar Rasheed, Dr., Sher, Sheriyaat aur Fiction, Lahore, Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, p.483
16. Shams-ur-Rehman Farooqui, Kayee Chaand Thay Sar-e-Aasmaan,Same as above 4, p.209
17. Ibid, P.845
18. Ibid, p.208
19. Ibid, p.190
20. Farooq Usman, Dr., Urdu Novel Mein Muslim Saqafat, Multan, Becon Books, p.426.427
21. Shams-ur-Rehman Farooqui, Kayee Chaand Thay Sar-e-Aasmaan,Same as above 4, p.249